لفظ

ظالم ظلوم اور جہول کی حقیقت

اور عالم آخرت میں تمثلی ظہور

(حصہ اوّل)

ماخوذ از کتاب، آئینہ کمالاتِ اسلام

مصنفہ :- حضرت مسیح موعود علیہ السلام

شایع کردہ

حضرت مولانا شیخ عبد الرحمان مصری صاحب

افسر

شعبہ دعوت وارشاد

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور

جولائی ۱۹۰۸ء قادر پریس لاہور بار اوّل تعداد ایک ہزار

www.aaiil.org

حقیقتِ اسلام

اور

اُس کے حصول کے وسائل

اور

اُس کے ثمرات

اب قبل اس کے جو ہم دُوسری بحثوں کی طرف توجہ کریں اس بحث کا لکھنا نہایت ضروری ہے جو دینِ اسلام کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت تک پہنچنے کے وسائل کیا ہیں؛ اور اس حقیقت پر پابند ہونے کے ثمرات کیا ہیں؟ کیونکہ بہت سے اسرارِ دقیقہ کا سمجھنا اسی بات پر موقوف ہے کہ پہلے حقیقتِ اسلام اور پھر اس حقیقت کے وسائل اور پھر اس کے ثمرات بخوبی ذہن نشین ہو جائیں اور ہمارے اندرونی مخالفوں کے لئے یہ بات نہایت فائدہ مند ہوگی کہ وہ حقیقتِ اسلام اور اس کی ابحاثِ متعلقہ کو توجہ سے پڑھیں۔ کیونکہ جن شکوک و شبہات میں وہ مبتلا ہیں اکثر وہ ایسے ہیں کہ فقط

اسی وجہ سے دلوں میں پیدا ہوئے ہیں کہ اسلام کی اتم اور اکمل حقیقت اور اس کے وسائل اور ثمرات پر غور نہیں کی گئی۔ اور اس بات میں کچھ شبہ نہیں کہ ان تمام حقیقتوں پر غور کرنے کے بعد اس عاجز کے اندرونی مخالف اپنے اعتراضات کے مقابل پر میرے جوابات کو پڑھیں گے۔ تو بہت سے اوہام اور وساوس سے مخلصی پا جائیں گے۔ بشرطیکہ وہ غور سے پڑھیں۔ اور پھر ان مقامات کو نظر کے سامنے رکھ کر میرے ان جوابات کو سوچیں جو میں نے ان کے شبہات کے قلع قمع کے لئے لکھے ہیں۔

ایسا ہی مخالفینِ مذہب کو بھی اِن حقائق کے بیان کرنے سے بہت فائدہ ہوگا۔ اور وہ اس مقام سے سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب کیا چیز ہے اور اس کی سچائی کے نشان کیا ہیں؟

اب واضح ہو کہ لغتِ عرب میں اسلام اس کو کہتے ہیں کہ بطور پیشگی ایک چیز کا مول دیا جائے۔ اور یا یہ کہ کسی کو اپنا کام سونپیں اور یا یہ کہ صلح کے طالب ہوں اور یا یہ کہ کسی امر یا خصومت کو چھوڑ دیں۔

اور اصطلاحی معنے اسلام کے وہ ہیں جو اس آیتِ کریمہ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ کہ:-

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

یعنی مسلمان وہ ہے جو خدا تعالےٰ کی راہ میں اپنا تمام وجود سونپ دیوے یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالےٰ کے لئے اور اس کے ارادوں کی پیروی

کے لئے اور اس کی خوشنودی کے حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیوے۔ اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لئے قائم ہو جائے۔ اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اس کی راہ میں لگا دیوے۔ مطلب یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر محض خدا تعالیٰ کا ہو جاوے۔

"اعتقادی" طور پر اس طرح سے کہ اپنے تمام وجود کو درحقیقت ایک ایسی چیز سمجھ لے جو خدا تعالیٰ کی شناخت اور اس کی اطاعت اور اس کے عشق اور محبت اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔

اور "عملی" طور پر اس طرح سے کہ خالصاً للہ حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق اور ہر یک خداداد توفیق سے وابستہ ہیں بجا لاوے مگر ایسے ذوق وشوق و حضور سے کہ گویا وہ اپنی فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے معبودِ حقیقی کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے۔

پھر بقیہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جس کی اعتقادی و عملی صفائی ایسی محبت ذاتی پر مبنی ہو اور ایسے طبعی جوش سے اعمالِ حسنہ اس سے صادر ہوں وہی ہے جو عند اللہ مستحق اجر ہے اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ کچھ غم رکھتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگوں کے لئے نجات نقد موجود ہے۔ کیونکہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لا کر اس سے موافقت تامہ ہو گئی اور ارادہ اس کا خدا تعالیٰ کے ارادہ سے ہمرنگ ہو گیا اور تمام لذت اس کی فرمانبرداری میں ٹھہر گئی اور جمیع اعمالِ صالحہ نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذذ

اور احتفاظ کی کشش سے صادر ہونے لگے تو یہی وہ کیفیت ہے جس کو فلاح اور نجات اور رستگاری سے موسوم کرنا چاہیئے۔ اور عالم آخرت میں جو کچھ نجات کے متعلق مشہود و محسوس ہوگا وہ در حقیقت اسی کیفیت راسخہ کے اظلال و آثار ہیں۔ جو اس جہان میں جسمانی طور پر ظاہر ہو جائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ بہشتی زندگی اسی جہان سے شروع ہو جاتی ہے۔ اور جہنمی عذاب کی جڑھ بھی اسی جہان کی گندی اور کورانہ زیست ہے۔

اب آیات ممدوحہ بالا پر ایک نظر غور ڈالنے سے ہر یک سلیم العقل سمجھ سکتا ہے۔ کہ اسلام کی حقیقت تب کسی میں متحقق ہو سکتی ہے کہ جب اس کا وجود مع اپنی تمام باطنی و ظاہری قوتوں کے محض خدا تعالےٰ کے لئے اور اس کی راہ میں وقف ہو جاوے۔ اور جو امانتیں اس کو خدا تعالےٰ کی طرف سے ملی ہیں پھر اسی معطی حقیقی کو واپس دی جائیں۔ اور نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ عمل کے آئینہ میں بھی اپنے اسلام اور اس کی حقیقت کاملہ کی ساری شکل دکھلائی جاوے۔

یعنی شخص مدعی اسلام یہ بات ثابت کر دیوے کہ اس کے ہاتھ اور پیر اور دل اور دماغ اور اس کی عقل اور اس کا فہم اور اس کا غضب اور اس کا رحم اور اس کا حلم اور اس کا علم اور اس کی تمام روحانی اور جسمانی قوتیں اور اس کی عزت اور اس کا مال اور اس کا آرام اور سرور اور جو کچھ اس کا سر کے بالوں سے پیروں کے ناخنوں تک باعتبار ظاہر و باطن کے ہے۔

یہاں تک کہ اس کی نیات اور اس کے دل کے خطرات اور اس کے نفس

کے جذبات سب خدا تعالیٰ کے ایسے تابع ہو گئے ہیں کہ جیسے ایک شخص کے اعضاء اس شخص کے تابع ہوتے ہیں۔ غرض یہ ثابت ہو جائے کہ صدق قدم اس درجہ تک پہنچ گیا ہے۔ کہ جو کچھ اس کا ہے۔ وہ اس کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہو گیا ہے۔ اور تمام اعضاء اور قوے الٰہی خدمت میں ایسے لگ گئے ہیں کہ گویا وہ جوارح الحق ہیں۔

اور ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات بھی صاف اور بدیہی طور پر ظاہر ہو رہی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی کا وقف کرنا جو حقیقت اسلام ہے۔ دو قسم پر ہے:۔

ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کو ہی اپنا معبود اور مقصود اور محبوب ٹھہرایا جاوے اور اس کی عبادت اور محبت اور خوف اور رجا میں کوئی دوسرا شریک باقی نہ رہے۔ اور اس کی تقدیس اور تسبیح اور عبادت اور تمام عبودیت کے آداب اور احکام اور اوامر اور حدود اور آسمانی قضا و قدر کے امور بدل و جان قبول کئے جائیں اور نہایت نیستی اور تذلل سے ان سب حکموں اور حدوں اور قانونوں اور تقدیروں کو بارادت تمام سر پر اٹھالیا جاوے اور نیز وہ تمام پاک صداقتیں اور پاک معارف جو اس کی وسیع قدرتوں کے معرفت کا ذریعہ اور اس کی ملکوت اور سلطنت کے علو مرتبہ کو معلوم کرنے کے لئے ایک واسطہ اور اس کے آلاء اور نعماء کے پہچاننے کے لئے ایک قوی رہبر ہیں بخوبی معلوم کرلی جائیں۔

دوسری قسم اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کرنے کی یہ ہے کہ اس کے بندوں کی خدمت اور ہمدردی اور چارہ جوئی اور باربرداری اور

سچی غمخواری میں اپنی زندگی وقف کر دی جاوے۔ دوسروں کو آرام پہنچانے کے لئے دکھ اٹھاویں۔ اور دوسروں کی راحت کے لئے اپنے پر رنج گوارا کرلیں۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اسلام کی حقیقت نہایت ہی اعلیٰ ہے اور کوئی انسان کبھی اس شریف لقب اہل اسلام سے حقیقی طور پر ملقب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنا سارا وجود معہ اس کے تمام قوتوں اور خواہشوں اور ارادوں کے حوالہ بخدا نہ کر دیوے۔ اور اپنی انانیت سے مع اس کے جمیع لوازم کے ہاتھ اٹھا کر اسی کی راہ میں نہ لگ جائے۔

پس حقیقی طور پر اسی وقت کسی کو مسلمان کہا جائے گا۔ کہ جب اس کی غافلانہ زندگی پر ایک سخت انقلاب وارد ہو کر اس کے نفس امارہ کا نقش ہستی معہ اس کے تمام جذبات کے یکدفعہ مٹ جائے۔ اور پھر اس موت کے بعد محسن للہ ہونے کے نئی زندگی اس میں پیدا ہو جائے۔ اور وہ ایسی پاک زندگی ہو جو اس میں بجز طاعت خالق اور ہمدردی مخلوق کے اور کچھ بھی نہ ہو خالق کی طاعت اس طرح سے کہ اس کی عزت و جلال اور یگانگت ظاہر کرنے کے لئے بیعزتی اور ذلت قبول کرنے کے لئے مستعد ہو۔ اور اس کی وحدانیت کا نام زندہ کرنے کے لئے ہزاروں موتوں کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔ اور اس کی فرمانبرداری میں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو بخوشی خاطر کاٹ سکے اور اس کے احکام کی عظمت کا پیار اور اس کی رضا جوئی کی پیاس گناہ سے ایسی نفرت دلادے کہ گویا وہ کھا جانے والی ایک آگ ہے۔ یا

ہلاک کرنے والی ایک زہر ہے۔ یا بھسم کر دینے والی ایک بجلی ہے۔ جس سے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ بھاگنا چاہیے۔

غرض اُس کی مرضی ماننے کے لئے اپنے نفس کی سب مرضیات چھوڑ دے۔ اور اس کے پیوند کے لئے جانکاہ زخموں سے مجروح ہونا قبول کرلے اور اس کے تعلق کا ثبوت دینے کے لئے سب نفسانی تعلقات توڑ دے۔

اور خلق اللہ کی خدمت اس طرح سے کہ جس قدر خلقت کی حاجات ہیں۔ اور جس قدر مختلف وجوہ اور طرق کی راہ سے قسّام ازل نے بعض کو بعض کا محتاج کر رکھا ہے۔ ان تمام امور میں محض للہ اور اپنی حقیقی اور بغیر ضانہ اور سچی ہمدردی سے جو اپنے وجود سے صادر ہو سکتی ہے۔ ان کو نفع پہنچاوے اور ہر یک مدد کے محتاج کو اپنی خدا داد قوت سے مدد دے اور ان کی دُنیا و آخرت دونوں کی اصلاح کے لئے زور لگا دے۔

مگر یہ للّٰہی وقف محض اُس صورت میں اسم بامسمّی ہوگی۔ کہ جب تمام اعضاء للّٰہی طاعت کے رنگ سے ایسے رنگ پذیر ہو جائیں کہ گویا وہ ایک الٰہی آلہ ہیں۔ جن کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً افعال الٰہیّہ ظہور پذیر ہوتے ہیں یا ایک مصفّا آئینہ ہیں۔ جس میں تمام مرضیات الٰہیہ بصفائے تام عکسی طور پر ظہور پکڑتی رہتی ہیں۔ اور جب اِس درجہ کاملہ پر للّٰہی طاعات وخدمات پہنچ جائیں تو اس صبغۃ اللہ کی برکت سے اس وصف کے انسان کی قوٰے اور جوارح کی نسبت وحدت شہودی کے طور پر یہ کہنا صحیح ہوتا ہے۔ کہ مثلاً یہ آنکھیں خداتعالےٰ کی آنکھیں اور یہ زبان خداتعالےٰ کی زبان اور یہ ہاتھ خداتعالیٰ

کے ہاتھ اور یہ کان خدا تعالےٰ کے کان اور یہ پاؤں خدا تعالےٰ کے پاؤں ہیں۔ کیونکہ وہ تمام اعضاء اور قوتیں للہی راہوں میں خدا تعالےٰ کے ارادوں سے پُر ہو کر اور اُس کی خواہشوں کی تصویر بن کر اس لائق ہو جاتے ہیں کہ ان کو اسی کا رُوپ کہا جاوے۔

وجہ یہ کہ جیسے ایک شخص کے اعضاء پورے طور پر اس کی مرضی اور ارادہ کے تابع ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کامل انسان اُس درجہ پر پہنچ کر خدا تعالےٰ کی مرضیات وارادات سے موافقت تامہ پیدا کر لیتا ہے۔ اور خدا تعالےٰ کی عظمت اور وحدانیت اور مالکیت اور معبودیت اور اس کی ہر ایک مرضی اور خواہش کی بات ایسی ہی اس کو پیاری معلوم ہوتی ہے۔ کہ جیسی خود خدا تعالےٰ کو۔

سو یہ عظیم الشان للہی طاعت و خدمت جو پیار اور محبت سے ملی ہوئی اور خلوص اور حنیفیت تامہ سے بھری ہوئی ہے۔ یہی اسلام اور اسلام کی حقیقت اور اسلام کا لب لباب ہے جو نفس اور خلق اور ہوا اور ارادہ سے موت حاصل کرنے کے بعد ملتا ہے۔

اس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ آیت موصوفہ بالا یعنی "بلٰی من اسلم وجہہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون" سعادت تامہ کے تینوں ضروری درجوں یعنے فنا اور بقا اور لقا کی طرف اشارت کرتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اسلم وجہہ للہ کا فقرہ یہ تعلیم کر رہا ہے کہ تمام قوے اور اعضاء اور جو کچھ اپنا ہے خدا تعالےٰ کو سونپ دینا چاہیئے۔ اور اس کی راہ میں وقف

کر دینا چاہیئے۔ اور یہ وہی کیفیت ہے جس کا نام دُوسرے لفظوں میں فنا ہے۔ وجہ یہ کہ جب انسان نے حسبِ مفہوم اس آیت ممدوحہ کے اپنا تمام وجود معہ اس کی تمام قوتوں کے خداتعالےٰ کو سونپ دیا اور اس کی راہ میں وقف کر دیا اور اپنی نفسانی جنبشوں اور سکونوں سے بکلی باز آگیا تو بلاشبہ ایک قسم کی موت اس پر طاری ہوگئی۔ اور اسی موت کو اہل تصوّف فنا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

پھر بعد اس کے " وَھُوَ مُحْسِنٌ " کا فقرہ مرتبہ بقا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ جب انسان بعد فنا اکمل و اتم و سلب جذباتِ نفسانی۔ الٰہی جذبہ اور تحریک سے پھر جنبش میں آیا اور بعد منقطع ہو جانے تمام نفسانی حرکات کے پھر ربّانی تحریکوں سے پُر ہو کر حرکت کرنے لگا تو یہ وہ حیاتِ ثانی ہے جس کا نام بقا رکھنا چاہیئے۔

پھر بعد اس کے یہ فقرات " فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون " جو اثبات و ایجاب اجر و نفی و سلب خوف و حزن پر دلالت کرتی ہیں یہ حالت بقا کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس وقت انسان کی عرفان اور یقین اور توکل اور محبت میں ایسا مرتبہ عالیہ پیدا ہو جائے کہ اُس کے خلوص اور ایمان اور وفا کا اجر اس کی نظر میں وہمی اور خیالی اور ظنی نہ رہے۔ بلکہ ایسا یقینی اور قطعی اور مشہود اور مرئی اور محسوس ہو کہ گویا وہ اس کو مل چکا ہے۔ اور خداتعالےٰ کے وجود پر ایسا یقین ہو جائے گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور ہر یک آئندہ کا خوف اس کی نظر سے اُٹھ

جاوے اور ہر یک گذشتہ اور موجودہ غم کا نام ونشان نہ رہے اور ہر یک روحانی تنعم موجود الوقت نظر آوے تو یہی حالت جو ہر یک قبض اور کدورت سے پاک اور ہر یک دغدغہ اور شک سے محفوظ اور ہر یک درد انتظار سے منزہ ہے لقا کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس مرتبہ لقا پر محسن کا لفظ جو آیت میں موجود ہے نہایت صراحت سے دلالت کر رہا ہے کیونکہ احسان حسب تشریح نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسی حالت کاملہ کا نام ہے کہ جب انسان اپنی پرستش کی حالت میں خدا تعالےٰ سے ایسا تعلق پیدا کرے کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے۔

اور یہ لقا کا مرتبہ تب سالک کیلئے کامل طور پر متحقق ہوتا ہے کہ جب ربانی رنگ بشریت کے رنگ وبو کو بتمام وکمال اپنے رنگ کے نیچے متواری اور پوشیدہ کر دیوے جس طرح آگ لوہے کے رنگ کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے کہ نظر ظاہر میں بجز آگ کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ وہی مقام ہے جس پر پہنچ کر بعض سالکین نے لغزشیں کھائی ہیں۔ اور شہودی پیوند کو وجودی پیوند کے رنگ میں سمجھ لیا ہے۔

اس مقام میں جو اولیاء اللہ پہنچے ہیں یا جن کو اس میں سے کوئی گھونٹ میسر آگیا ہے۔ بعض اہلِ تصوف نے اُن کا نام اطفال اللہ رکھدیا ہے۔ اس مناسبت سے کہ وہ لوگ صفات الٰہی کے کنار عاطفت میں بکلی جا پڑے ہیں۔ اور جیسے ایک شخص کا لڑکا اپنے حلیہ اور خط وخال میں کچھ اپنے باپ سے مناسبت رکھتا ہے ویسا ہی ان کو بھی ظلی طور پر بوجہ تخلق باخلاق

اللہ خدا تعالیٰ کی صفات جمیلہ سے کچھ مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے نام اگرچہ کھلے کھلے طور پر بزبان شرع مستعمل نہیں ہیں مگر درحقیقت عارفوں نے قرآن کریم سے ہی اس کو استنباط کیا ہے کیونکہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے

"فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم او اشد ذکرا"

یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو کہ جیسے تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔

اور ظاہر ہے کہ اگر مجازی طور پر ان الفاظ کا بولنا منہیات شرع سے ہوتا تو خدا تعالیٰ ایسی طرز سے اپنی کلام کو منزہ رکھتا جس سے اس اطلاق کا جواز مستنبط ہو سکتا ہے۔

اور اس درجہ لقا میں بعض اوقات انسان سے ایسے امور صادر ہوتے ہیں کہ جو بشریت کی طاقتوں سے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور الٰہی طاقت کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جیسے ہمارے سید و مولیٰ سید الرسل حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنگ بدر میں ایک سنگریزوں کی مٹھی کفار پر چلائی اور وہ مٹھی کسی دعا کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود اپنی روحانی طاقت سے چلائی مگر اس مٹھی نے خدائی طاقت دکھلائی اور مخالف کی فوج پر ایسا خارق عادت اس کا اثر پڑا کہ کوئی ان میں سے ایسا نہ رہا کہ جس کی آنکھ پر اس کا اثر نہ پہنچا ہو اور وہ سب اندھوں کی طرح ہو گئے۔ اور ایسی سراسیمگی اور پریشانی ان میں پیدا ہو گئی کہ مدہوشوں کی طرح بھاگنا شروع کیا۔ اسی معجزہ کی طرف اللہ جل شانہٗ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے۔

"وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ" یعنی جب تو نے

اُس مٹھی کو پھینکا وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا تعالےٰ نے پھینکا یعنی درپردہ الٰہی طاقت کام کر گئی انسانی طاقت کا یہ کام نہ تھا۔

اور ایسا ہی دُوسرا معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا جو شق القمر ہے اسی الٰہی طاقت سے ظہور میں آیا تھا کوئی دُعا اس کے ساتھ شامل نہ تھی۔ کیونکہ وہ صرف انگلی کے اشارہ سے جو الٰہی طاقت سے بھری ہوئی تھی۔ وقوع میں آ گیا تھا۔ اور اس قسم کے اور بھی بہت سے معجزات ہیں جو صرف ذاتی اقتدار کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے دکھلائے۔ جن کے ساتھ کوئی دعا نہ تھی۔ کئی دفعہ تھوڑے سے پانی کو جو صرف ایک پیالہ میں تھا اپنی اُنگلیوں کو اُس پانی کے اندر داخل کرنے سے اس قدر زیادہ کر دیا کہ تمام لشکر اور اونٹوں اور گھوڑوں نے وہ پانی پیا اور پھر بھی وہ پانی ویسا ہی اپنی مقدار پر موجود تھا۔ اور کئی دفعہ دو چار روٹیوں پر ہاتھ رکھنے سے ہزارہا بھوکوں پیاسوں کا اُن سے شکم سیر کر دیا۔ اور بعض اوقات تھوڑے دودھ کو اپنی لبوں سے برکت دے کر ایک جماعت کا پیٹ اُس سے بھر دیا۔ اور بعض اوقات شور آب کنوئیں میں اپنے منہ کا لعاب ڈال کر اُس کو نہایت شیریں کر دیا۔ اور بعض اوقات سخت مجروحوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر ان کو اچھا کر دیا۔ اور بعض اوقات آنکھوں کو جن کے ڈیلے لڑائی کے کسی صدمہ سے باہر جا پڑے اپنے ہاتھ کی برکت سے پھر درست کر دیا۔

ایسا ہی اور بھی بہت سے کام اپنے ذاتی اقتدار سے کئے جن کے ساتھ ایک چھپی ہوئی طاقت الٰہی مخلوط تھی۔

حال کے برہمو اور فلسفی اور نیچری اگران معجزات سے انکار کریں تو وہ معذور ہیں کیونکہ وہ اس مرتبہ کو شناخت نہیں کر سکتے. جس میں ظلی طور پر الہٰی طاقت انسان کو ملتی ہے. پس اگر وہ ایسی باتوں پر ہنسیں تو وہ اپنے ہنسنے میں بھی معذور ہیں. کیونکہ انہوں نے بجز طفلانہ حالت کے اور کسی درجہ روحانی بلوغ کو طے نہیں کیا. اور نہ صرف اپنی حالت ناقص رکھتے ہیں. بلکہ اس بات پر خوش ہیں کہ اسی حالت ناقصہ میں مریں بھی.

مگر زیادہ تر افسوس ان عیسائیوں پر ہے جو بعض خوارق اسی کے مشابہ مگران سے ادنیٰ حضرت مسیح میں سُن سنا کران کی الوہیت کی دلیل ٹھہرا بیٹھے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کا مُردوں کا زندہ کرنا اور مفلوجوں اور مجذوموں کا اچھا کرنا اپنے اقتدار سے تھا. کسی دعا سے نہیں تھا. اور یہ دلیل اس بات پر ہے کہ وہ حقیقی طور پر ابن اللہ بلکہ خدا تھا. لیکن افسوس کہ ان بےچاروں کو خبر نہیں کہ اگر انہیں باتوں سے انسان خدا بن جاتا ہے تو اس خدائی کا زیادہ تر استحقاق ہمارے سیّد و مولےٰ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ہے کیونکہ اس قسم کے اقتداری خوارق جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے دکھلائے ہیں حضرت مسیح علیہ السلام ہرگز نہیں دکھلا سکے. اور ہمارے ہادی و مقتدا صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے یہ اقتداری خوارق نہ صرف آپ ہی دکھلائے بلکہ ان خوارق کا ایک لمبا سلسلہ روز قیامت تک اپنی امت میں چھوڑ دیا. جو ہمیشہ اور ہر زمانہ میں حسب ضرورت زمانہ ظہور میں آتا رہا ہے. اور اس دنیا کے آخری دنوں تک اسی طرح ظاہر ہوتا رہے گا. اور الہٰی طا

کا پرتوہ جس قدر اس اُمّت کی مقدّس روحوں پر پڑا ہے اس کی نظیر دوسری امتوں میں ملنی مشکل ہے۔ پھر کس قدر بیوقوفی ہے کہ ان خارق عادت امور کی وجہ سے کسی کو خُدا یا خُدا کا بیٹا قرار دیا جائے۔ اگر ایسے ہی خوارق سے انسان خُدا بن سکتا ہے تو پھر خداؤں کا کچھ انتہا بھی ہے؟

لیکن یہ بات اس جگہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔ کہ اس قسم کے اقتداری خوارق گو خدا تعالےٰ کی طرف سے ہی ہوتے ہیں مگر پھر بھی خدا تعالےٰ کے اُن خاص افعال سے جو بلا توسط ارادہ غیری ظہور میں آتے ہیں۔ کسی طور سے برابری نہیں کر سکتے۔ اور نہ برابر ہونا ان کا مناسب ہے۔ اسی وجہ سے جب کوئی نبی یا ولی اقتداری طور پر بغیر توسط کسی دعا کے کوئی ایسا امر خارق عادت دکھلاوے جو انسان کو کسی حیلہ اور تدبیر اور علاج سے اس کی قوت نہیں دے گی۔ تو نبی کا وہ فعل خدا تعالےٰ کے ان افعال سے کم رتبہ پر رہے گا۔ جو خود خدا تعالےٰ علانیہ اور بالجہر اپنی قوّت کاملہ سے ظہور میں لاتا ہے یعنی ایسا اقتداری معجزہ بہ نسبت دوسرے الہٰی کاموں کے جو بلا واسطہ اللہ جلّ شانہٗ سے ظہور میں آتے ہیں۔ ضرور کچھ نقص اور کمزوری اپنے اندر موجود رکھتا ہوگا۔ تا سرسری نگاہ والوں کی نظر میں تشابہ فی الخلق واقع نہ ہو۔ اسی وجہ سے حضرت موسےٰ علیہ السلام کا عصا باوجود اس کے کہ کئی دفعہ سانپ بنا لیکن آخر عصا کا عصا ہی رہا۔ اور حضرت مسیح کی چڑیاں باوجودیکہ معجزہ کے طور پر ان کا پرواز قرآن کریم سے ثابت ہے۔ مگر پھر بھی مٹی کے مٹی ہی تھے۔ اور کہیں خدا تعالےٰ نے یہ فرمایا کہ وہ زندہ بھی ہوگئیں اور

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اقتداری خوارق میں چونکہ طاقت الٰہی سب سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ کیونکہ وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا تجلّیاتِ الٰہیہ کے لئے اتم واعلےٰ وارفع واکمل نمونہ تھا۔ اس لئے ہماری نظریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اقتداری خوارق کو کسی درجہ بشریت پر مقرر کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر تاہم ہمارا اس پر ایمان ہے۔ کہ اس جگہ بھی اللہ جل شانہ' اور اس کے رسولِ کریم کے فعل میں مخفی طور پر کچھ فرق ضرور ہوگا:۔

اب ان تحریرات سے ہماری غرض اسی قدر ہے کہ لقا کا مرتبہ جب کسی انسان کو میسّر آتا ہے۔ تو اس مرتبہ کی تموّج کے اوقات میں الٰہی کام ضرور اس سے صادر ہوتے ہیں اور ایسے شخص کی گہری صحبت میں جو شخص ایک حصہ عمر کا بسر کرے تو ضرور کچھ نہ کچھ بہ اقتداری خوارق مشاہدہ کرے گا۔ کیونکہ اس تموّج کی حالت میں کچھ الٰہی صفات کا رنگ ظلّی طور پر اس میں آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا رحم خدا تعالےٰ کا رحم اور اس کا غضب خدا تعالےٰ کا غضب ہوجاتا ہے۔ اور بسا اوقات وہ بغیر کسی دعا کے کہتا ہے کہ فلاں چیز پیدا ہوجائے۔ تو وہ پیدا ہوجاتی ہے۔ اور کسی پر غضب کی نظر سے دیکھتا ہے۔ تو اس پر کوئی وبال نازل ہوجاتا ہے۔ اور کسی کو رحمت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ تو وہ خدا تعالےٰ کے نزدیک مورد رحم ہوجاتا ہے اور جیسا کہ خدا تعالےٰ کا کُن دائمی طور پر نتیجہ مقصودہ کو بلاتخلف پیدا کرتا ہے ایسا ہی اس کا کُن بھی اس تموّج اور مدّ کیحالت

میں خطا نہیں جاتا اور جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ان اقتداری خوارق کی اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ یہ شخص شدتِ اتصال کی وجہ سے خدائے عزّوجل کے رنگ سے ظلی طور پر رنگین ہو جاتا ہے۔ اور تجلّیاتِ الہیہ اس پر دائمی قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور محبوب حقیقی جب حائلہ کو درمیان سے اٹھا کر نہایت شدید قرب کی وجہ سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ وہ خود مبارک ہے ایسا ہی اُس کے اقوال و افعال و حرکات اور سکنات اور خوراک اور پوشاک اور مکان اور زمان اور اس کے جمیع لوازم میں برکت رکھ دیتا ہے۔ تب ہر یک چیز جو اس سے مَس کرتی ہے بغیر اس کے جو یہ دُعا کرے برکت پاتی ہے۔ اس کے مکان میں برکت ہوتی ہے اس کے دروازوں کے آستانے برکت سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس کے گھر کے دروازوں پر برکت برستی ہے۔ جو ہر دم اس کو مشاہدہ ہوتی ہے۔ اور اس کی خوشبو اس کو آتی ہے۔ جب یہ سفر کرے تو خدا تعالیٰ معہ اپنی تمام برکتوں کے اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جب یہ گھر میں آوے تو ایک دریا نور کا ساتھ لاتا ہے۔ غرض یہ عجیب انسان ہوتا ہے جس کی کُنہ بجُز خدا تعالےٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ فنا فی اللہ کے درجہ کی تحقق کے بعد یعنے اُس درجہ کے بعد جو اسلم وجھہ للہ کے مفہوم کو لازم ہے۔ جس کو، صوفی فنا کے نام سے اور قرآن کریم استقامت کے اِسم سے موسوم کرتا ہے درجہ بقاء اور لقا کا بلا توقف پیچھے آنے والا ہے۔ یعنی جبکہ انسان خلق اور ہوا اور ارادہ سے بکلی خالی ہو کر فنا کی حالت کو پہنچ گیا۔ تو اس حالت کے راسخ ہونے

کے ساتھ ہی بقا کا درجہ شروع ہوجاتا ہے۔ مگر جب تک یہ حالت راسخ نہ ہو اور خداتعالےٰ کی طرف بکلی جھک جانا ایک طبعی امر نہ ٹھہر جائے تب تک مرتبہ بقا کا پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ وہ مرتبہ صرف اُسی وقت پیدا ہوگا کہ جب ہر یک اطاعت کا تصنع درمیان سے اٹھ جائے۔ اور ایک طبعی روئیدگی کی طرح فرمانبرداری کی سرسبز اور لہراتی ہوئی شاخیں دل سے جوش مار کر نکلیں اور واقعی طور پر سب کچھ جو اپنا سمجھا جاتا ہے۔ خداتعالےٰ کا ہوجائے۔ اور جیسے دُوسرے لوگ ہوا پرستی میں لذّت اٹھاتے ہیں اُس شخص کی تمام کامل لذتیں پرستش اور یادِ الٰہی میں ہوں اور بجائے نفسانی ارادوں کے خداتعالےٰ کی مرضیات جگہ پکڑ لیں۔

پھر جب یہ بقا کی حالت بخوبی استحکام پکڑ جائے اور سالک کے رگ و ریشہ میں داخل ہوجائے اور اس کا جزو وجود بن جائے اور ایک نور آسمان سے اُترتا ہوا دکھائی دے جس کے نازل ہونے کے ساتھ ہی تمام پردے دُور ہوجائیں۔ اور نہایت لطیف اور شیریں حلاوت سے ملی ہوئی ایک محبت دل میں پیدا ہو جو پہلے نہیں تھی۔ اور ایک ایسی خنکی اور اطمینان اور سکینت اور سرور دل کو محسوس ہو کہ جیسے ایک نہایت پیارے دوست مدت کے بچھڑے ہوئے کی یکدفعہ ملنے اور بغلگیر ہونے سے محسوس ہوتی ہے۔ اور خداتعالےٰ کے روشن اور لذیذ اور مبارک اور سرور بخش اور فصیح اور معطّر اور مبشرانہ کلمات اٹھتے اور بیٹھتے اور سوتے اور جاگتے اس طرح پر نازل ہونے شروع ہوجائیں کہ جیسے ایک ٹھنڈی اور دلکش اور پُرخوشبو ہوا ایک گلزار پر گذر کر آتی اور صبح کے وقت چلنی شروع ہوتی اور اپنے ساتھ

ایک سُکر اور سرور لاتی ہے۔ اور انسان خدا تعالےٰ کی طرف ایسا کھینچا جائے کہ بغیر اس کی محبت اور عاشقانہ تصور کے جی نہ سکے اور نہ یہ کہ مال اور جان اور عزت اور اولاد اور جو کچھ اس کا ہے قربان کرنے کے لئے تیار ہو۔ بلکہ اپنے دل میں قربان کر ہی چکا ہو اور ایسی ایک زبردست کشش سے کھینچا گیا ہو جو نہیں جانتا کہ اُسے کیا ہو گیا۔ اور نورانیت کا بشدت اپنے اندر انتشار پاوے۔ جیسا کہ دن چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اور صدق اور محبت اور وفا کی نہریں بڑے زور سے چلتی ہوئی اپنے اندر مشاہدہ کرے اور لمحہ بہ لمحہ ایسا احساس کرتا ہو کہ گویا خدا تعالےٰ اس کے قلب پر اترا ہوا ہے۔ جب یہ حالت اپنی تمام علامتوں کے ساتھ محسوس ہو تب خوشی کرو اور محبوب حقیقی کا شکر بجالاؤ کہ یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کا نام بقا رکھا گیا ہے۔

اِس آخری مقام میں انسان ایسا احساس کرتا ہے۔ کہ گویا بہت سے پاک پانیوں سے اس کو دھو کر اور نفسانیت کا بکلی رگ و ریشہ اس سے الگ کر کے نئے سرے اس کو پیدا کیا گیا اور پھر رب العالمین کا تخت اس کے اندر بچھایا گیا۔ اور خدائے پاک و قدوس کا چمکتا ہوا چہرہ اپنے تمام دلکش حسن جمال کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اس کے سامنے موجود ہو گیا ہے۔ مگر ساتھ اس کے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دونوں آخری درجہ بقا اور لقا کے کسبی نہیں ہیں بلکہ وہبی ہیں اور کسب اور جدوجہد کی حد صرف فنا کے درجہ تک ہے۔ اور اسی حد تک تمام راستباز سالکوں کا سیر و سلوک ختم ہوتا ہے۔ اور دائرہ کمالات انسانیہ کا اپنے استدارت تامہ کو پہنچتا ہے۔ اور جب اس درجہ فنا کو پاک باطن

لوگ جیسا کہ چاہیئے طے کر چکتے ہیں تو عادتِ الٰہیہ اسی طرح پر جاری ہے کہ یک دفعہ عنایت الٰہی کی نسیم چل کر بقا اور لقا کے درجہ تک انہیں پہنچا دیتی ہے۔

اب اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ اس سفر کی تمام صعوبتیں اور مشقتیں فنا کی حد تک ہی ہیں اور پھر اس سے آگے گذر کر انسان کی سعی اور کوشش اور مشقت اور محنت کو دخل نہیں بلکہ وہ محبت صافیہ جو فنا کی حالت میں خداوند کریم و جلیل سے پیدا ہوتی ہے۔ الٰہی محبت کا خود بخود اس پر ایک نمایاں شعلہ پڑتا ہے جس کو مرتبہ بقا اور لقا سے تعبیر کرتے ہیں اور جب محبت الٰہی بندہ کی محبت پر نازل ہوتی ہے۔ تب دونوں محبتوں کے ملنے سے روح القدس کا ایک روشن اور کامل سایہ انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اور لقا کے مرتبہ پر اس روح القدس کی روشنی نہایت ہی نمایاں ہوتی ہے۔ اور اقتداری خوارق جن کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں۔ اسی وجہ سے ایسے لوگوں سے صادر ہوتے ہیں۔ کہ یہ روح القدس کی روشنی ہر وقت اور ہر حال ہیں ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ اور اُن کے اندر سکونت رکھتی ہے اور وہ اُس روشنی سے کبھی اور کسی حال میں جدا نہیں ہوتے اور نہ وہ روشنی اُن سے جدا ہوتی ہے۔ وہ روشنی ہر دم ان کے تنفس کے ساتھ نکلتی ہے اور ان کی نظر کے ساتھ ہر یک چیز پر پڑتی ہے۔ اور ان کی کلام کے ساتھ اپنی نورانیت لوگوں کو دکھلاتی ہے۔ اُسی روشنی کا نام روح القدس ہے مگر یہ حقیقی روح القدس نہیں۔ حقیقی روح القدس وہ ہے جو آسمان پر ہے۔ یہ روح القدس اس کا ظل ہے۔ جو پاک سینوں اور دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ کے لئے آباد ہو جاتا ہے۔ اور ایک طرفۃ العین کے لئے بھی ان سے جدا نہیں

ہوتا اور جو شخص تجویز کرتا ہے کہ یہ روح القدس کسی وقت اپنی تمام تاثیرات کیساتھ اُن سے جدا ہو جاتا ہے وہ شخص سراسر باطل پر ہے اور اپنی پرظلمت خیال سے خدا تعالیٰ کے مقدس برگزیدوں کی توہین کرتا ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ حقیقی روح القدس تو اپنے مقام پر ہی رہتا ہے۔ لیکن روح القدس کا سایہ جس کا نام مجازاً روح القدس ہی رکھا جاتا ہے۔ ان سینوں اور دلوں اور دماغوں اور تمام اعضا میں داخل ہوتا ہے جو مرتبہ بقا اور لقا کا پاکر اس لائق ٹھہر جاتے ہیں۔ کہ ان کی نہایت اصفیٰ اور اجلیٰ محبت پر خدا تعالیٰ کی کامل محبت اپنی برکات کے ساتھ نازل ہو۔ اور جب وہ روح القدس نازل ہوتا ہے۔ تو اس انسان کے وجود سے ایسا تعلق پکڑ جاتا ہے۔ کہ جیسے جان کا تعلق جسم سے ہوتا ہے۔ وہ قوت بینائی بن کر آنکھوں میں کام دیتا ہے۔ اور قوت شنوائی کا جامہ پہن کر کانوں کو روحانی حس بخشتا ہے۔ وہ زبان کی گویائی اور دل کے تقوے اور دماغ کی ہشیاری بن جاتا ہے۔ اور ہاتھوں میں بھی سرایت کرتا ہے۔ اور پیروں میں بھی اپنا اثر پہنچاتا ہے۔ غرض تمام ظلمت کو وجود میں سے اٹھا دیتا ہے۔ اور سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک منور کر دیتا ہے۔ اور اگر ایک طرفۃ العین کے لئے بھی علیحدہ ہو جائے۔ تو فی الفور اس کی جگہ ظلمت آجاتی ہے۔ مگر وہ کاملوں کو ایسا نعم القرین عطا کیا گیا ہے۔ کہ ایک دم کے لئے بھی اُن سے علیحدہ نہیں ہوتا اور یہ گمان کرنا کہ ان سے علیحدہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرے لفظوں میں اس بات کا اقرار ہے کہ وہ بعد اس کے جو روشنی میں آگئے پھر تاریکی میں پڑ جاتے ہیں۔ اور

بعد اس کے جو معصوم یا محفوظ کئے گئے پھر نفس امّارہ ان کی طرف عود کر آتا ہے اور بعد اس کے جو روحانی حواس ان پر کھولے گئے پھر وہ تمام حواس بیکار اور معطل کئے جاتے ہیں۔

سو اے لوگو جو اس صداقت سے منکر اور اس نکتہ معرفت سے انکاری ہو جلد سے جلدی مت کرو اور اپنے ہی نورِ قلب سے گواہی طلب کرو کہ کیا یہ امر واقعی ہے کہ برگزیدوں کی روشنی کسی وقت بتمام وکمال ان سے دُور بھی ہو جاتی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ کہ وہ تمام نورانی نشان کامل مومنوں سے کمال ایمان کی حالت میں کبھی گم بھی ہو جاتے ہیں۔

حقیقتِ اسلامیہ کے حصُول کے وسائل

اب پھر ہم اصل بحث کی طرف جو بیان کیفیتِ اسلام ہے عنانِ قلم پھیرتے ہیں۔ سو واضح ہو کہ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلام کیا چیز ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ سو اس بیان کے بعد یہ تذکرہ بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ حقیقت جس کا نام اسلام ہے کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ اور قرآن کریم میں اس کے حصُول کے لئے کیا کیا وسائل بیان فرمائے گئے ہیں۔

اوّل جاننا چاہیئے کہ کسی شئے کا وسیلہ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ٹھیک ٹھیک استعمال یا مدد سے اُس شئے کا میسّر آ جانا ضروری ہو۔ اور اُس کے عوض

اس کی نقیض کا استعمال کرنا موجب بعد و ناکامی ہو۔

بعد اس کے واضح ہو کہ اگرچہ قرآن کریم نے حقیقتِ اسلامیہ کی تحصیل کے لئے بہت سے وسائل بیان فرمائے ہیں۔ مگر درحقیقت اُن سب کا مآل دو قسم پر ہی جا ٹھہرتا ہے۔ اول یہ کہ خداتعالے کی ہستی اور اس کی مالکیت تامہ اور اس کی قدرت تامہ اور اس کی حکومت تامہ اور اس کے علم تام اور اس کے حساب تام اور نیز اس کے واحد لاشریک اور حیّ و قیوم اور حاضر ناظر ذوالاقتدار ازلی ابدی ہونے میں اور اس کی تمام قوتوں اور طاقتوں اور جمیع جلال و کمال کے ساتھ یگانہ ہونے میں پورا پورا یقین آجائے۔ یہاں تک کہ ہر ایک ذرّہ اپنے وجود اور اس تمام عالم کے وجود کا اس کے تصرف اور حکم میں دکھائی دے۔ اور ھوالقاھر فوق عبادہ کی تصویر سامنے نظر آجاوے۔ اور نقش راسخ بیدہ ملکوت السموات والارض کا جلی قلم کے ساتھ دل میں لکھا جائے۔ یہاں تک کہ اس کی عظمت اور ہیبت اور کبریائی تمام نفسانی جذبات کو اپنی قہری شعاعوں سے مضمحل اور خیرہ کر کے ان کی جگہ لے لے اور ایک دائمی رعب اپنا دل پر جما دیوے۔ اور اپنے قہری حملہ سے نفسانی سلطنت کے تخت کو خاک مذلّت میں پھینک دیوے۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیوے اور اپنے خوفناک کرشموں سے غفلت کی دیواروں کو گرا دے اور تکبّر کے میناروں کو توڑ دے اور ظلمت بشری کی حکومتیں وجود انسانی کی دارالسلطنت سے بکلی اٹھا دیوے اور جو جذبات نفس امارہ کی طبیعت انسانی پر حکومت کرتے تھے اور باعزّت سمجھے گئے تھے اُن کو ذلیل اور خوار اور ہیچ اور بیمقدار کر کے دکھلا دیوے۔

دوم : یہ کہ اللہ جلّ شانہٗ کے حسن و احسان پر اطلاع وافر پیدا کرے کیونکہ کامل درجہ کی محبت یا تو حُسن کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے اور یا احسان کے ذریعہ سے اور اللہ جلّ شانہٗ کا حسن اس کی ذات اور صفات کی خوبیاں ہیں۔ اور خوبیاں یہ ہیں کہ وہ خیر محض اور مبدا ہے۔ جمیع فیضوں کا اور مصدر ہے تمام خیرات کا اور جامع ہے۔ تمام کمالات کا اور مرجع ہے۔ ہر یک امر کا اور موجد ہے تمام وجودوں کا اور علت العلل ہے۔ ہر یک مؤثر کا جس کی تاثیر یا عدم تاثیر ہر یک وقت اس کے قبضہ میں ہے۔ اور واحد لا شریک ہی اپنی ذات میں اور صفات میں اور اقوال میں اور افعال میں اور اپنے تمام کمالوں میں اور ازلی اور ابدی ہے۔ اپنی جمیع صفات کاملہ کے ساتھ۔ بڑا ہی نیک اور بڑا ہی رحیم باوجود قدرت کاملہ سزا دہی کے ہزاروں برسوں کی خطائیں ایک دم کے رجوع میں بخشنے والا بڑا ہے حلیم اور بردبار اور پردہ پوش کروڑہا نفرت کے کاموں اور مکروہ گناہوں کو دیکھنے والا اور پھر جلد نہ پکڑنے والا اگر اس کا روحانی جمال تمثّل کے طور پر ظاہر ہو تو ہر یک دل پروانہ کی طرح اس پر گرے پر اس نے اپنا جمال غیروں سے چھپایا اور انہیں پر ظاہر کیا جو صدق سے اس کو ڈھونڈھتے ہیں۔ اس نے ہر یک خوبصورت چیز پر اپنے حسن کا پرتو ڈالا۔ اگر آفتاب ہے یا ماہتاب یا وہ سیارے جو چمکتے ہوئے نہایت پیارے معلوم ہوتے ہیں یا خوبصورت انسانوں کے مونہہ جو دلکش اور ملیح دکھائی دیتے ہیں۔ یا وہ تازہ اور سبز اور خوشنما پھول جو اپنے رنگ اور بو اور آب و تاب سے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ سب درحقیقت ظلی طور پر اس حُسنِ لازوال

سے ایک ذرہ کے موافق حصّہ لیتے ہیں وہ حُسن ظن اور وہم اور خیال نہیں۔ بلکہ یقینی اور قطعی اور نہایت روشن ہے۔ جس کے تصور سے تمام نظر ہی خیرہ ہوتی ہیں۔ اور پاک دل اس کی طرف کھینچے جاتے ہیں اور اس محبوب حقیقی کے احسانات جو انسان پر ہیں وہ دفتروں میں سما نہیں سکتے۔ کیونکہ اس کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ گناہ پر گناہ دیکھتا ہے۔ اور احسان پر احسان کرتا ہے۔ اور خطا پر خطا پاتا ہے اور نعمت پر نعمت دیتا ہے۔ درحقیقت نہ زید ہم سے کچھ بھلائی کر سکتا ہے اور نہ بکر۔ نہ آفتاب اپنی روشنی سے ہم کو کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نہ ماہتاب اپنے نور سے ہم کو کوئی نفع دے سکتا ہے۔ نہ تارے ہمارے کام آسکتے ہیں۔ نہ ان کی تاثیر کچھ چیز ہے۔ ایسا ہی نہ دوست کام آسکتا ہے نہ فرزند غرض کوئی چیز بھی ہمیں آرام نہیں پہنچا سکتی۔ جب تک وہ ارادہ نہ فرماوے۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ ہزارہا اور بے شمار طریقوں سے جو ہماری حاجات پوری ہوتی ہیں درحقیقت یہ فضل اسی منعم حقیقی کی طرف سے ہے۔

پس اس کے انعامات کو کون گن سکتا ہے۔ اگر ہم انصاف سے بولیں تو ہمیں یہ شہادت دینی پڑے گی کہ کسی نے ہم سے ایسا پیار نہیں کیا جیسا کہ اُس نے، یہ دونوں قسم کے وسائل جن پر حقیقت اسلامیہ کا حاصل ہونا موقوف ہے۔ قرآن کریم میں ان دونوں وسیلوں کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے "انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء" الجزو نمبر ۲۲ سورۃ الفاطر۔ یعنے اللّٰہ جلّ شانہٗ سے وہ لوگ ڈرتے ہیں۔ جو اس کی عظمت اور قدرت اور احسان

اور حسن اور جمال پر علم کامل رکھتے ہیں۔ خشیت اور اسلام درحقیقت اپنے مفہوم کے رُو سے ایک ہی چیز ہے کیونکہ کمال خشیت کا مفہوم اسلام کے مفہوم کو مستلزم ہے پس اس آیت کریمہ کے معنوں کا مآل اور ماحصل یہی ہوا کہ اسلام کے حصول کا وسیلہ کاملہ یہی علم عظمت ذات وصفات باری ہے۔ جس کی ہم تفصیل لکھ چکے ہیں اور اسی کی طرف درحقیقت اشارہ اس آیت میں بھی ہے:۔

"یوتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً" یعنے جس کو خدا تعالےٰ چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اس کو خیر کثیر دی گئی۔ حکمت سے مراد علم عظمت ذات صفات باری ہے۔ اور خیر کثیر سے مراد اسلام ہے۔

جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں فرماتا ہے: ھو خیر مما یجمعون پھر ایک دُوسری آیت میں فرماتا ہے: قل رب زدنی علما" یعنے اے میرے رب تو مجھے اپنی عظمت اور معرفت شیون اور صفات کا علم کامل بخش۔ اور پھر دُوسری جگہ فرمایا:" وبذالک امرت وانا اول المسلمین" ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم جو اول المسلمین ٹھہرے تو اس کا یہی باعث ہوا کہ اوروں کی نسبت علوم معرفت الٰہی میں اعلم ہیں۔ یعنے علم ان کا معارف الٰہیہ کے بارے میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے ان کا اسلام بھی سب سے اعلےٰ ہے اور وہ اول المسلمین ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اس زیادت علم کی طرف اسی دوسری آیت میں بھی اشارہ ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:۔

" وعلمك ما لم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما "
الجزو ۵ - یعنے خداتعالے نے تجھ کو وہ علوم عطا کئے جو تو خود بخود نہیں
جان سکتا تھا۔ اور فضل الٰہی سے فیضانِ الٰہی سب سے زیادہ تیرے پر ہوا۔
یعنے تو معارف الٰہیہ اور اسرار اور علوم ربّانی میں سب سے بڑھ گیا۔ اور
خداتعالے نے اپنی معرفت کے عطر کے ساتھ سب سے زیادہ تجھے معطر کیا
غرض علم اور معرفت کو خداتعالے نے حقیقتِ اسلامیہ کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا
ہے۔ اور اگرچہ حصول حقیقت اسلام کے وسائل اور بھی ہیں۔ جیسے صوم و صلوٰۃ
اور دعا اور تمام احکامِ الٰہی جو چھ سو سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔ لیکن علم عظمت و وحدانیت
ذات اور معرفت شیون و صفات جلالی و جمالی حضرت باری عزّ اسمہٗ وسیلۃ
الوسائل اور سب کا موقوف علیہ ہے۔ کیونکہ جو شخص غافلِ دل اور معرفت الٰہی سے
بکلی بے نصیب ہے وہ کب توفیق پا سکتا ہے کہ صوم اور صلوٰۃ بجا لاوے
یا دعا کرے یا اور خیرات کی طرف مشغول ہو ان سب اعمال صالحہ کا محرک تو معرفت
ہی ہے۔ اور یہ تمام دوسرے وسائل دراصل اسی کے پیدا کردہ ہیں اور اُسی
کے بنین و بنات ہیں۔ اور ابتدا اس معرفت کی پرتوہ اسم رحمانیت سے ہے
نہ کسی عمل سے نہ کسی دُعا سے بلکہ بلا علّتِ فیضان سے صرف ایک موہبت
ہے۔ یھدی من یشاء و یضل من یشاء مگر پھر یہ معرفت اعمالِ صالحہ
اور حُسنِ ایمان کے شمول سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر الہام
اور کلامِ الٰہی کے رنگ میں نزول پکڑ کر تمام صحن سینہ کو اس نور سے منور کر
دیتی ہے۔ جس کا نام اسلام ہے۔ اور اس معرفت تامہ کے درجہ پر پہنچ کر اسلام

صرف لفظی اسلام نہیں رہتا۔ بلکہ وہ تمام حقیقت اس کی جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ حاصل ہو جاتی ہے۔ اور انسانی روح نہایت انکسار سے حضرت احدیت میں اپنا سر رکھ دیتی ہے۔ تب دونوں طرف سے یہ آواز آتی ہے کہ جو میرا سو تیرا ہے۔ یعنے بندہ کی رُوح بھی بولتی ہے اور اقرار کرتی ہے کہ یا الٰہی جو میرا ہے سو تیرا ہے۔ اور خدا تعالےٰ بھی بولتا ہے اور بشارت دیتا ہے کہ اے میرے بندے جو کچھ زمین و آسمان وغیرہ میرے ساتھ ہے وہ سب تیرے ساتھ ہے۔ اسی مرتبہ کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے۔ قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمتہ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا الجزو (۲۴) سورۃ الزمر یعنے کہہ اے میرے غلامو جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے۔ کہ تم رحمت الٰہی سے نا امید مت ہو۔ خدا تعالےٰ سارے گناہ بخش دے گا۔ اب اس آیت میں بجائے قل یا عباد اللہ کے جس کے یہ معنے ہیں کہ کہہ اے خدا تعالےٰ کے بندو یہ فرمایا کہ قل یا عبادی یعنے کہہ اے میرے غلامو۔ اس طرز کے اختیار کرنے میں بھید یہی ہے۔ کہ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی ہے۔ کہ تا خدا تعالےٰ بے انتہا رحمتوں کی بشارت دیوے اور جو لوگ کثرتِ گناہوں سے دلِ شکستہ ہیں ان کو تسکین بخشے سو اللہ جلّ شانہٗ نے اس آیت میں چاہا کہ اپنی رحمتوں کا ایک نمونہ پیش کرے اور بندہ کو دکھلاوے کہ میں کہاں تک اپنے وفادار بندوں کو انعامات خاصہ سے مشرف کرتا ہوں سو اس نے قل یا عبادی کے لفظ سے یہ ظاہر کیا کہ دیکھو میرا پیارا رسول دیکھو یہ برگزیدہ بندہ کہ کمال طاعت سے کس درجہ تک پہنچا کہ

اب جو کچھ میرا ہے وہ اُس کا ہے جو شخص نجات چاہتا ہے وہ اس کا غلام
ہو جائے یعنے ایسا اس کی طاعت میں محو ہو جاوے کہ گویا اس کا غلام ہے
تب وہ گو کیسا ہی پہلے گناہ گار تھا بخشا جائے گا۔ جاننا چاہیئے کہ عبد کا لفظ
لغت عرب میں غلام کے معنوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ
فرماتا ہے، ولعبد مؤمن خیرٌ من مشرك اور اس آیت میں اس بات
کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اپنی نجات چاہتا ہے وہ اس نبی سے غلامی
کی نسبت پیدا کرے یعنے اس کے حکم سے باہر نہ جائے۔ اور اس کے دامن
طاعت سے اپنے تئیں وابستہ جانے جیسا کہ غلام جانتا ہے تب وہ
نجات پائے گا۔ اس مقام میں ان کورباطن نام کے موحدوں پر افسوس
آتا ہے۔ کہ جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے یہاں تک بغض
رکھتے ہیں۔ کہ اُن کے نزدیک یہ نام کہ غلام نبی غلام رسول غلام مصطفےٰ غلام
احمد غلام محمد شرک میں داخل ہیں۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ مدار نجات
یہی نام ہیں۔ اور چونکہ عبد کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ ہر ایک آزادگی
اور خودروی سے باہر آجائے۔ اور پورا متبع اپنے مولیٰ کا ہو۔ اس لئے حق
کے طالبوں کو یہ رغبت دی گئی کہ اگر نجات چاہتے ہیں تو یہ مفہوم اپنے اندر
پیدا کریں۔ اور درحقیقت یہ آیت اور دوسری آیت ، قل ان کنتم تحبون
اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم ازروئے مفہوم کے
ایک ہی ہیں۔ کیونکہ کمال اتباع اس محویت اور طاعت تامہ کو مستلزم
ہے جو عبد کے مفہوم میں پائی جاتی ہے۔ یہی سر ہے۔ کہ جیسے پہلے

آیت میں مغفرت کا وعدہ بلکہ محبوب الٰہی بلنے کی خوشخبری ہے گویا یہ آیت کہ قل یاعبادی دوسرے لفظوں میں اس طرح پر ہے کہ قل یا متبعی یعنے اے میری پیروی کرنے والو جو بکثرت گناہوں میں مبتلا ہو رہے ہو رحمتِ الٰہی سے نومید مت ہو کہ اللہ جلّ شانہٗ ببرکت میری پیروی کے تمام گناہ بخشدے گا۔ اور اگر عباد سے صرف اللہ تعالےٰ کے بندے ہی مراد لئے جائیں تو معنے خراب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہرگز درست نہیں کہ خدا تعالےٰ بغیر تحقق شرط ایمان اور بغیر تحقق شرط پیروی تمام مشرکوں اور کافروں کو یوں ہی بخش دیوے۔ ایسے معنے تو نصوص بینہ قرآن سے صریح مخالف ہیں۔

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ ماحصل اس آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ دل و جان سے تیرے یا رسول اللہ غلام بن جائیں گے ان کو وہ نور ایمان اور محبت اور عشق بخشا جائے گا کہ جو ان کو غیر اللہ سے رہائی دے گا اور وہ گناہوں سے نجات پا جائیں گے۔ اور اسی دنیا میں ایک پاک زندگی ان کو عطا کی جائے گی۔ اور نفسانی جذبات کی تنگ و تاریک قبروں سے وہ نکالے جائیں گے اسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔ انا الحاشر الذی یحشر الناس علےٰ قدمی "یعنے میں وہ مُردوں کو اٹھانے والا ہوں جس کے قدموں پر لوگ اٹھائے جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ قرآن کریم اِس محاورہ سے بھرا پڑا ہے۔ کہ دنیا مر چکی تھی اور خدا تعالےٰ نے اپنے اس نبی خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھیج کر نئے سرے دنیا کو زندہ کیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے "اعلموا انّ اللّٰہ یحی الارض بعد موتھا" یعنے اس بات کو سُن رکھو کہ زمین کو اس کے

مرنے کے بعد خدا تعالےٰ زندہ کرتا ہے پھر اُسی کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہؓ کے حق میں فرماتا ہے: "وایدھم بروح منہ" یعنے اُن کو رُوح القدس کے ساتھ مدد دی اور رُوح القدس کی مدد یہ ہے کہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اور روحانی موت سے نجات بخشتا ہے اور پاکیزہ قوتیں اور پاکیزہ حواس اور پاک علم عطا فرماتا ہے۔ اور علومِ یقینیہ اور براہینِ قطعیہ سے خدا تعالیٰ کے مقامِ قرب تک پہنچا دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے مقرب وہی ہیں جو یقینی طور پر جانتے ہیں کہ وہ ہے اور یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اس کی قدرتیں اور اس کی رحمتیں اور اس کی عفوتیں اور اس کی عدالتیں سب سچ ہے اور وہ جمیع فیوض کا مبداء اور تمام نظامِ عالم کا سرچشمہ اور تمام سلسلہ مؤثرات اور متاثرات کا علّت العلل ہے مگر متصرف بالارادہ جس کے ہاتھ میں کُل ملکوت السمٰوات والارض ہے اور یہ علوم جو مدار نجات ہیں یقینی اور قطعی طور پر بجز اُس حیات کے حاصل نہیں ہو سکتے جو بتوسط رُوح القدس انسان کو ملتی ہے اور قرآن کریم کا بڑے زور شور سے یہ دعوےٰ ہے کہ وہ حیات روحانی صرف متابعت اس رسول کریم سے ملتی ہے اور تمام وہ لوگ جو اس نبی کریم کی متابعت سے سرکش ہیں وہ مردے ہیں جن میں اس حیات کی روح نہیں ہے اور حیات روحانی سے مراد انسان کے وہ علمی اور عملی قویٰ ہیں۔ جو روح القدس کی تائید سے زندہ ہو جاتے ہیں اور قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جن احکام پر اللہ جلّ شانہ انسان کو قائم کرنا چاہتا ہے وہ چھ سو ہیں ایسا ہی اس کے مقابل پر جبرائیل علیہ السلام کے پر بھی چھ سو ہیں اور بیضہ بشریت جب تک چھ سو حکم کو سر پر رکھ کر جبرائیل کے پروں کے نیچے

نہ آوے اُس میں فنافی اللہ ہونے کا بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور انسانی حقیقت اپنے اندر چھ سو بیضیہ کی استعداد رکھتی ہے۔ پس جس شخص کا چھ سو بیضیا استعداد جبرائیل کے چھ سو پر کے نیچے آگیا وہ انسان کامل اور یہ تولد اس کا تولد کامل اور یہ حیات حیات کامل ہے اور غور کی نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ بیضیہ بشریت کے روحانی بچے جو روح القدس کی معرفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت کی برکت سے پیدا ہوئے وہ اپنی کمیت اور کیفیت اور صورت اور نوع اور حالت میں تمام انبیاء کے بچوں سے اتم اور اکمل ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس" یعنے تم سب امتوں سے بہتر ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لئے پیدا کئے گئے ہو اور درحقیقت جس قدر قرآنی تعلیم کے کمالات خاصہ ہیں وہ اس اُمت مرحومہ کے استعدادی کمالات پر شاہد ہیں۔ کیونکہ اللہ جل شانہٗ کی کتابیں ہمیشہ اسی قدر نازل ہوتی ہیں جس قدر اُس امت میں جو تعمیل کتاب کی مکلف ہے استعداد ہوتی ہے۔ مثلاً انجیل کی نسبت تمام محققین کی یہ رائے ہے کہ اس کی تعلیم کامل نہیں ہے۔ اور وہ ایک ہی پہلو پر چلی جاتی ہے۔ اور دوسرے پہلو کو بکلی چھوڑ رہی ہے۔ لیکن دراصل یہ قصور اُن استعدادوں کا ہے جن کے لئے انجیل نازل ہوئی تھی۔ چونکہ خدا تعالےٰ نے انسانی استعدادوں کو تدریجاً ترقی دی ہے۔ اس لئے اوائل زمانوں میں اکثر ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ کہ جو غبی اور بلید اور کم عقل اور کم فہم اور کم دل اور کم ہمت اور کم یقین اور پست خیال اور دنیا کے لالچوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور دماغی اور دلی قوتیں ان کی نہایت ہی کمزور تھیں مگر ان زمانوں کے بعد ہمارے

سید ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وہ زمانہ آیا جس میں رفتہ رفتہ استعدادیں ترقی کر گئیں۔ گویا دنیا نے اپنے فطرتی تو ے میں ایک اور ہی صورت بدل لی۔ پس ان کی کامل استعدادوں کے موافق کامل تعلیم نے نزول فرمایا۔

اسلام کے ثمرات

اب ہم کسی قدر اس بات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے ثمرات کیا ہیں سو واضح ہو کہ جب کوئی اپنے مولیٰ کا سچا طالب کامل طور پر اسلام پر قائم ہو جائے اور نہ کسی تکلف اور بناوٹ سے بلکہ طبعی طور پر خدا تعالیٰ کی راہوں میں ہر ایک قوت اس کے کام میں لگ جائے تو آخری نتیجہ اُس کی حالت کا یہ ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی ہدایت کے اعلیٰ تجلیات تمام حُجب سے مبرا ہو کر اسکی طرف رُخ کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کے برکات اس پر نازل ہوتے ہیں۔ اور وہ احکام اور وہ عقائد جو محض ایمان اور سماع کے طور پر قبول کئے گئے تھے اب بذریعہ مکاشفات صحیحہ اور الہامات یقینیہ قطعیہ مشہود اور محسوس طور پر کھولے جاتے ہیں۔ اور وہ مغلقات شرع اور دین کے اور اسرار سر بستہ ملت حنیفیہ کے اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور ملکوت الہٰی کا اس کو سیر کرایا جاتا ہے تا وہ یقین اور معرفت میں مرتبہ کامل حاصل کرے اور اس کی زبان اور اس کے بیان اور تمام افعال اور اقوال اور حرکات و سکنات میں ایک برکت رکھی جاتی ہے اور

ایک فوق العادت شجاعت اور استقامت اور ہمّت اس کو عطا کی جاتی ہے۔ اور شرح صدر کا ایک اعلےٰ مقام اس کو عنایت کیا جاتا ہے اور بشریت کے حجابوں کی تنگ دلی اور خست اور بخل اور بار بار کی لغزش اور تنگ چشمی اور غلامی شہوات اور رواءت اخلاق اور ہر ایک قسم کی نفسانی تاریکی بکلّی اس سے دُور کر کے اس کی جگہ ربّانی اخلاق کا نور بھر دیا جاتا ہے۔ تب وہ بکلّی مبدّل ہو کر ایک نئی پیدائش کا پیرایہ پہن لیتا ہے اور خدا تعالیٰ سے سنتا اور خدا تعالیٰ سے دیکھتا اور خدا تعالیٰ کیساتھ حرکت کرتا اور خدا تعالیٰ کے ساتھ ٹھہرتا ہے۔ اور اس کا غضب خدائے تعالےٰ کا غضب اور اُس کا رحم خدا تعالےٰ کا رحم ہو جاتا ہے۔ اور اس درجہ میں اس کی دعائیں بطورِ اصطفاؔ کے منظور ہوتی ہیں۔ نہ بطور ابتلا کے اور وہ زمین پر حجت اللہ اور امان اللہ ہوتا ہے۔ اور آسمان پر اس کے وجود سے خوشی کی جاتی ہے اور اعلےٰ سے اعلےٰ عطیہ جو اس کو عطا ہوتا ہے مکالمات الٰہیہ اور مخاطبات حضرت یزدانی ہیں جو بغیر شک اور شبہ اور کسی غبار کے چاند کے نور کی طرح اس کے دل پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایک شدید الاثر لذّت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور طمانیت اور تسلی اور سکینت بخشتے ہیں۔ اور اس کلام اور الہام میں فرق یہ ہے کہ الہام کا چشمہ تو گویا ہر وقت مقرب لوگوں میں بہتا ہے۔ اور وہ رُوح القدس کے بلائے بولتے اور رُوح القدس کے دکھائے دیکھتے اور روح القدس کے سنائے سنتے ہیں۔ اور ان کے تمام ارادے رُوح القدس کے نفخ سے ہی پیدا ہوتے ہیں اور یہ بات سچ اور بالکل سچ ہے کہ وہ ظلی طور پر اس آیت کا مصداق ہوتے ہیں:-

"وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحٰی" لیکن مکالمہ الٰہیہ ایک

الگ امر ہے اور وہ یہ ہے کہ وحی متلو کی طرح خدا تعالےٰ کا کلام ان پر نازل ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے سوالات کا خدا تعالےٰ سے ایسا جواب پاتے ہیں کہ جیسا ایک دوست دوست کو جواب دیتا ہے۔ اور اس کلام کی اگر ہم تعریف کریں تو صرف اس قدر کہ سکتے ہیں کہ وہ اللہ جلّ شانہٗ کی ایک تجلّی خاص کا نام ہے جو بذریعہ اُس کے مقرب فرشتہ کے ظہور میں آتی ہے۔ اور اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ تا دُعا کے قبول ہونے سے اطلاع دی جائے یا کوئی نئی اور مخفی بات بتائی جائے یا آئندہ کی خبروں پر آگاہی دی جائے یا کسی امر میں خدا تعالےٰ کی مرضی اور عدم مرضی پر مطلع کیا جائے۔ یا کسی اور قسم کے واقعات میں یقین اور معرفت کے مرتبہ تک پہنچایا جائے بہر حال یہ وحی ایک الٰہی آواز ہے۔ جو معرفت اور اطمینان سے رنگین کرنے کے لئے منجانب اللہ پیرایہ مکالمہ و مخاطبہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اس کی کیفیت بیان کرنا غیر ممکن ہے کہ وہ صرف الٰہی تحریک اور ربّانی نفخ سے بغیر کسی قسم کے فکر اور تدبّر اور خوض اور غور اور اپنے نفس کی دخل کے خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک قدسی ندا ہے۔ جو لذیذ اور پُر برکت الفاظ میں محسوس ہوتی ہے۔ اور اپنے اندر ایک ربّانی تجلّی اور الٰہی صولت رکھتی ہے۔

اس جگہ ہر ایک سچے طالب کے دل میں بالطبع یہ سوال پیدا ہوگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے کہ تا یہ مرتبہ عالیہ مکالمہ الٰہیہ حاصل کر سکوں۔ پس اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی ہستی ہے جس میں نئی قوتیں نئی طاقتیں نئی زندگی عطا کی جاتی ہے۔ اور نئی ہستی پہلی ہستی کی فنا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور جب پہلی ہستی ایک

سچی اور حقیقی قربانی کے ذریعہ سے جو فدائے نفس اور فدائے عزت و مال و دیگر لوازم نفسانیہ سے مراد ہے بکلی جاتی رہے۔ تو یہ دوسری ہستی فی الفور اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ پہلی ہستی کے دور ہونے کے نشان کیا ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب پہلے خواص اور جذبات دور ہو کر نئے خواص اور نئے جذبات پیدا ہوں۔ اور اپنی فطرت میں ایک انقلاب عظیم نظر آوے اور تمام حالتیں کیا اخلاقی اور کیا ایمانی اور کیا تعبدی ایسی ہی بدلی ہوئی نظر آویں کہ گویا ان پر اب رنگ ہی اور ہے غرض جب اپنے نفس پر نظر ڈالے تو اپنے تئیں ایک نیا آدمی پاوے اور ایسا ہی خدا تعالیٰ بھی نیا ہی دکھائی دے اور شکر اور صبر اور یاد الٰہی میں نئی لذتیں پیدا ہو جائیں جن کی پہلے کچھ بھی خبر نہیں تھی اور بدیہی طور پر محسوس ہو کہ اب اپنا نفس اپنے رب پر بکلی متوکل اور غیر سے بکلی لاپرواہ ہے اور تصور وجود حضرت باری اس قدر اس کے دل پر استیلا پکڑ گیا ہے کہ اب اس کی نظر شہود میں وجود غیر بکلی معدوم ہے اور تمام اسباب ہیچ اور ذلیل اور بیقدر نظر آتے ہیں۔ اور صدق اور وفا کا مادہ اس قدر جوش میں آگیا ہے کہ ہر یک مصیبت کا تصور کرنے سے وہ مصیبت آسان معلوم ہوتی ہے اور نہ صرف تصور بلکہ مصائب کے وارد ہونے سے بھی ہر یک درد بر نگ لذت نظر آتا ہے تو جب یہ تمام علامات پیدا ہو جائیں تو سمجھنا چاہئیے کہ اب پہلی ہستی پر بکلی موت آگئی۔

اس موت کے پیدا ہو جانے سے عجیب طور کی قوتیں خدا تعالیٰ کی راہ میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ باتیں جو دوسرے کہتے ہیں پر کرتے نہیں اور وہ راہیں جو دوسرے دیکھتے ہیں پر چلتے نہیں اور وہ بوجھ جو دوسرے جل بچتے ہیں پر اٹھاتے نہیں۔ ان سب

امورِ شاقہ کی اُس کو توفیق دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی قوت سے نہیں بلکہ ایک زبردست الٰہی طاقت اُسکی اعانت اور امداد میں ہوتی ہے جو پہاڑوں سے زیادہ اس کو استحکام کی رُو سے کر دیتی ہے اور ایک وفادار دل اس کو بخشتی ہے۔ تب خدا تعالےٰ کے جلال کے لئے وہ کام اُس سے صادر ہوتے ہیں اور وہ صدق کی باتیں ظہور میں آتی ہیں۔ کہ انسان کیا چیز ہے اور آدم زاد کیا حقیقت ہے کہ خود بخود ان کو انجام دے سکے وہ بکلی غیر سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اور ماسوا اللہ سے دونوں ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ اور سب تفاوتوں اور فرقوں کو درمیان سے دُور کر دیتا ہے۔ اور وہ آزمایا جاتا اور دُکھ دیا جاتا ہے اور طرح طرح کے امتحانات اُس کو پیش آتے ہیں۔ اور ایسی مصائب اور تکالیف اُس پر پڑتی ہیں کہ اگر وہ پہاڑوں پر پڑتیں تو انہیں نابود کر دیتیں اور اگر وہ آفتاب اور ماہتاب پر وارد ہوتیں تو وہ بھی تاریک ہو جاتے۔ لیکن وہ ثابت قدم رہتا ہے۔ اور وہ تمام سختیوں کو بڑے انشراحِ صدر سے برداشت کر لیتا ہے۔ اور اگر وہ ہاون حوادث میں پیسا بھی جائے اور غبار سا کیا جائے تب بھی بغیر انی مع اللّٰہ کے اور کوئی آواز اُس کے اندر سے نہیں آتی۔ جب کسی کی حالت اس نوبت تک پہنچ جائے تو اُس کا معاملہ اس عالم سے وراء الوراء ہو جاتا ہے۔ اور ان تمام ہدایتوں اور مقاماتِ عالیہ کو ظلّی طور پر پا لیتا ہے۔ جو اس سے پہلے نبیوں اور رسولوں کو ملے تھے۔ اور انبیاء اور رُسل کا وارث اور نائب ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقت جو انبیاء میں معجزہ کے نام سے موسوم ہوتی ہے وہ اس میں کرامت کے نام سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور وہی حقیقت جو انبیاء میں عصمت کے نام سے نامزد کی جاتی ہے اس میں محفوظیت کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اور وہی حقیقت جو انبیاء میں نبوت کے نام سے بولی جاتی ہے

اس میں محدثیت کے پیرایہ میں ظہور پکڑتی ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے لیکن بباعث تشدد اور ضعف رنگ کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات مبارکہ اشارت فرما رہے ہیں کہ محدّث نبی بالقوہ ہوتا ہے اور اگر باب نبوت مسدود نہ ہوتا تو ہر یک محدّث اپنے وجود میں قوت اور استعداد نبی ہو جانے کی رکھتا تھا۔ اور اسی قوت اور استعداد کے لحاظ سے نبی کا حمل محدّث پر جائز ہے یعنے کہہ سکتے ہیں کہ المحدّث نبی جیسا کہہ سکتے ہیں کہ "العنب خمرٌ نظراً علی القوۃ والاستعداد ومثل ھذا الحمل شائع متعارف فی عبارات القوم وقد جرت المحاورات علی ذالک کما لا یخفی علی کل ذکی عالم مطلع علی کتب الادب والکلام والتصوف" اور اسی حمل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جل شانہ نے اس قرأت کو جو وما ارسلنا من رسولٍ ولا نبیٍّ ولا محدث ہے مختصر کر کے قرأت ثانی میں صرف یہ الفاظ کافی قرار دیئے کہ "وما ارسلنا من رسولٍ ولا نبیٍّ"

اور اس سوال کا جواب کہ جس شخص کو شرف مکالمہ الہیہ کا نصیب ہو وہ کب اور کن حالات میں افاضہ کلام الٰہی کا زیادہ تر مستحق ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ اکثر شدائد اور مصائب کے نزول کے وقت اولیاء اللہ پر کلام الٰہی نازل ہوتا ہے۔ تا ان کی تسلی اور تقویت کا موجب ہو جب وہ نزول آفات اور حوادث فوق الطاقت سے نہایت شکستہ اور دردمند اور کوفتہ ہو جاتے ہیں اور حزن اور قلق انتہاء کو پہنچ جاتا ہے۔ تب خداتعالےٰ کی صفت کلام اُن کے دل پر متجلی ہوتی ہے۔ اور کلمات طیبہ الہیہ سے ان کو سکینت اور تشفی بخشی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملہم کی انکساری حالت الہامی آگ کے افروختہ ہونے کے لئے بہت ہی دخل

رکھتی ہے جب ایک شرف یاب مکالمہ الٰہی کمال درد منداور مضطر ہوتا ہے اور اس کی توجہ درد اور حزن سے ملی ہوئی ایک تار بندھ جانے کی حالت تک پہنچ جاتی ہے اور وفاداری اور تضرع اور صدق کے ساتھ ربوبیت کی شعاعوں کے نیچے جا پڑتی ہے تو یکدفعہ ربوبیت کا ایک شعاع اپنی ربوبیت کی تجلّی کے ساتھ اس پر گرتا ہے اور اس کو روشن کر دیتا ہے اور وہ روشنی کبھی کلام کی صورت میں اور کبھی کشف کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور رجوع کرنے والے دل کو اس فتیلہ کی طرح جو آگ کے نزدیک پہنچ جاتا ہے اپنے ربانی نور سے منور کر دیتی ہے۔ کیا یہ بدیہی طور پر محسوس نہیں ہوتا جو ایک فتیلہ جو پاکیزہ تیل اپنے اندر رکھتا ہے جب آگ کے نزدیک کیا جاتا ہے تو وہ فی الفور صورت بدل لیتا ہے اور آگ کی صحبت سے واپس آنے وقت ایک چمکتا ہوا شعلہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ پس ایک عارف اور کامل انسان اس وقت مکالمہ الٰہیہ کے لئے نہایت ہی استعداد قریبہ رکھتا ہے جب وہ دردمند ہو کر آستانہ الٰہی پر گرتا ہے۔ اور ہر یک طرف سے منقطع ہو کر اس موافقت اور مصادقت کو جو اس کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی ہے۔ ایک تازہ اور نیا جوش دیتا ہے اور دردناک روح کے ساتھ خدا تعالیٰ کی مدد کیلئے التجا کرتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ اس کی سُنتا ہے اور اُسے نور اور محبت کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ اور اس پر رحم کرتا ہے اور اس کی دعاؤں کو اکثر قبول فرما لیتا ہے۔ آجکل کے بعض ملحدانہ خیال والے جو یورپ کے فلسفہ اور نیچر کے تابع ہو گئے ہیں اور اجابت اور قبولیت دُعا سے منکر ہیں ان کے یہ خیالات سراسر باطل ہیں کہ قبولیتِ دعا کچھ چیز نہیں۔ اور تحصیل مرادات کیلئے دعا کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ یاد رکھنا

چاہیئے کہ مومن پر خدا تعالےٰ کے فضلوں میں سے یہ ایک بڑا بھاری فضل ہوتا ہے
جو اُس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور اس کی درخواستیں گو کیسے ہی مشکل کاموں کے متعلق
ہوں اکثر بہ پایۂ اجابت پہنچتے ہیں اور دراصل ولایت کی حقیقت یہی ہے جو
ایسا قرب اور وجاہت حاصل ہو جائے جو بہ نسبت اُوروں کے بہت دعائیں
قبول ہوں کیونکہ ولی خدا تعالےٰ کا دوست ہوتا ہے اور خالص دوستی کی یہی
نشانی ہے۔ کہ اکثر درخواستیں اس کی قبول کی جائیں پس جو شخص کہتا ہے۔ کہ
دعا قبول ہونے کے اس سے زیادہ اور کچھ معنے نہیں کہ خدا تعالےٰ تک اُسکی
آواز پہنچ جاتی ہے۔ اور خدائے تعالےٰ جان لیتا ہے کہ اس نے دعا کی ہے
ایسا شخص مسخرہ ہے اور خدا تعالےٰ کی کتاب اور اس کے دین سے محض بیگانہ
ہے۔ اگر صرف دعا کا سُن لینا اجابت میں داخل ہے اور اس سے زیادہ کوئی
بات نہیں تو پھر ہر یک کہہ سکتا ہے کہ میری دُعا رد نہیں ہوئی۔ کیونکہ اگر اجابت
سے مطلب صرف اطلاع بر دُعا ہے تو پھر کون شخص ہے جس کی دُعا سے خدا
تعالےٰ بے خبر رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ بباعث اپنی صفت علیم
اور خبیر اور سمیع ہونے کے ہر یک بات کو سنتا ہے اور ہر یک شخص کی آواز اس تک
پہنچ جاتی ہے پھر ایسے سُننے میں مومن اور غیر مومن کی دُعا میں کیا فرق ہے اور یہ کہنا کہ
مومن کو لبیک کہتا ہے اور دُوسرے کو نہیں یہ کیونکر ثابت ہو جب کہ اصل محرومی
میں مومن اور غیر مومن دونوں مساوی ہیں تو ایک کافر بھی کہہ سکتا ہے کہ میری دُعا پر
لبیک کہا گیا ہے۔ تو اب اس کا کون فیصلہ کرے کہ نہیں کہا گیا اور ایسی بے معنی لبیک
کا فائدہ کیا بلکہ مومن کی دُعا ضرور قبول کی جاتی ہے اور گو مقبول کرنا مومن کے حق میں بہتر

نہ ہو تو کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ مومن کو نرمی اور محبت کی راہ سے بذریعہ محبّانہ مکالمہ کے اُسپر اطلاع دیجاتی ہے۔ خدا تعالیٰ جو تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ سب سے زیادہ رحمت مومن پر ہی کرتا ہے اور ہر ایک مصیبت کے وقت اُسے سنبھالتا ہے اور اُسکی حفاظت کرتا ہے اور اگر تمام دُنیا ایک طرف ہو اور مومن ایک طرف تو فتح مومن ہی کو دیتا ہے اور اُس کی عمر اور عافیت کے دن بڑھاتا ہے۔ دشمن کہتا ہے کہ وہ ہلاک ہو جائے اور ناپید ہو جائے پر وہ دشمن کو ہی ہلاک کرتا ہے اور اس کی بد دعائیں اُسی کے سر پہ مارتا ہے پر مومن کی دُعا کو قبول کر لیتا ہے اور اس کی دعاؤں کو قبول کر کے وہ خوارق دکھلاتا ہے جن سے دُنیا حیران ہو جاتی ہے۔ کرامت کیا چیز ہے؟ ! مومن کی دُعا جو قبول ہو کر ایک نہایت مشکل اور بعید از عقل کام کو پُورا کر دیتی ہے اور تمام خلقت کو ایک حیرت میں ڈالتی ہے۔ پھر کیونکر کہا جائے کہ دُعا قبول نہیں ہوتی نادان ہے وہ شخص جو ایسا خیال کرتا ہے۔ بیوقوف ہے وہ فلسفی جو ایسا سمجھتا ہے یہ دعوے بے دلیل نہیں اُسپر میرے پاس کھلے کھلے دلائل اور نہایت روشن براہین ہیں پر جو اپنی آنکھوں پر پٹی باندھتا ہے۔ تا آفتاب نظر نہ آوے وہ کیونکر روشنی کو دیکھ سکتا ہے۔

اب یہ بھی یاد رہے کہ وہ اسلام جس کی خوبیاں ہم بیان کر چکے ہیں وہ ایسی چیز نہیں ہے جس کے ثبوت کیلئے ہم صرف گذشتہ کا حوالہ دیں اور محض قبروں کے نشان دکھلائیں اسلام مردہ مذہب نہیں تا یہ کہا جائے کہ اس کی سب برکات پیچھے رہ گئی ہیں اور آگے خاتمہ ہے۔ اسلام میں بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کی برکات ہمیشہ اس کے ساتھ ہیں۔ اور وہ صرف گذشتہ قصوں کا سبق نہیں دیتا بلکہ موجودہ برکات پیش کرتا ہے۔ دُنیا کو برکات اور آسمانی نشانوں کی ہمیشہ ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے تھیں اور اب نہیں ہیں ضعیف اور عاجز

انسان جو اندھے کی طرح پیدا ہوتا ہے ہمیشہ اس بات کا محتاج ہے کہ آسمانی بادشاہت کا
اُس کو کچھ پتہ لگے اور وہ خدا جس کے وجود پر ایمان ہے اُسکی ہستی اور قدرت کے کچھ آثار
بھی ظاہر ہوں پہلے زمانہ کے نشان دوسرے زمانہ کیلئے کافی نہیں ہو سکتے کیونکہ خبر معائنہ
کی مانند نہیں ہو سکتی اور امتداد زمانہ سے خبریں ایک قصہ کے رنگ میں ہو جاتی ہیں ہر یک
نئی صدی جو آتی ہے تو گویا ایک نئی دنیا شروع ہوتی ہے اسلئے اسلام کا خدا جو سچا خدا ہے
ہر یک نئی دنیا کیلئے نئے نشان دکھلاتا ہے۔ اور ہر یک صدی کے سر پر اور خاص کر ایسی
صدی کے سر پر جو ایمان اور دیانت سے دُور پڑ گئی ہے اور بہت سی تاریکیاں اپنے اندر
رکھتی ہے۔ ایک قائم مقام نبی کا پیدا کر دیتا ہے جسکے آئینہ فطرت میں نبی کی شکل ظاہر ہوتی
ہے۔ اور وہ قائم مقام نبی متبوع کے کمالات کو اپنے وجود کے توسط سے لوگوں کو دکھلاتا ہے
اور تمام مخالفوں کو سچائی اور حقیقت نمائی اور پردہ دری کے رُو سے ملزم کرتا ہے۔ سچائی کے
رُو سے اس طرح کہ وہ سچے نبی پر ایمان نہ لائے پس وہ دکھلاتا ہے کہ وہ نبی سچا تھا اور اس کی
سچائی پر آسمانی نشان یہ ہیں اور حقیقت نمائی کی رُو سے اسطرح کہ اس نبی متبوع کے تمام مغلقات
دین کا حل کر کے دکھلا دیتا ہے اور تمام شبہات اور اعتراضات کا استیصال کر دیتا ہے
اور پردہ دری کے رُو سے اس طرح کہ وہ مخالفوں کے تمام پردے پھاڑ دیتا ہے اور دنیا
کو دکھلا دیتا ہے کہ وہ کیسے بے وقوف اور معارف دین کو نہ سمجھنے والے اور غفلت اور جہالت
اور تاریکی میں گرنے والے اور جناب الٰہی سے دُور و مہجور ہیں۔ اس کمال کا آدمی ہمیشہ مکالمہ
الٰہیہ کا خلعت پا کر آتا ہے اور زکی اور مبارک اور مستجاب الدعوات ہوتا ہے اور نہایت صفائی
سے ان باتوں کو ثابت کر کے دکھلا دیتا ہے کہ خدا ہے اور وہ قادر اور بصیر اور سمیع اور علیم
اور مدبّر بالارادہ ہے اور درحقیقت دعائیں قبول ہوتی ہیں اور اہل اللہ سے خوارق

ظاہر ہونے ہیں پس صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ آپ ہی معرفت الہیہ سے مالامال ہے بلکہ اس کے زمانہ میں دنیا کا ایمان عام طور پر دوسرا رنگ پکڑ لیتا ہے۔ اور وہ تمام خوارق جن سے دُنیا کے لوگ منکر تھے اور ان پر ہنستے تھے اور ان کو خلاف فلسفہ اور نیچر سمجھتے تھے۔ یا اگر بہت نرمی کرتے تھے تو بطور ایک قصہ اور کہانی کے ان کو مانتے تھے۔ اب اس کے آنے سے اور اس کے عجائبات ظاہر ہونے سے نہ صرف قبول ہی کرتے ہیں بلکہ اپنی پہلی حالت پر روتے اور تاسف کرتے ہیں کہ وہ کیسی نادانی تھی جس کو ہم عقلمندی سمجھتے تھے اور وہ کیسی بیوقوفی تھی جسکو ہم علم اور حکمت اور قانون قدرت خیال کرتے تھے غرض وہ خلق اللہ پر ایک شعلہ کی طرح گرتا ہے اور سب کو کم و بیش حسب استعدادات مختلفہ اپنے رنگ میں لے آتا ہے اگرچہ وہ اول میں آزمایا جاتا اور تکلیف میں ڈالا جاتا ہے اور لوگ طرح طرح کے دُکھ اس کو دیتے اور طرح طرح کی باتیں اس کے حق میں کہتے ہیں اور انواع اقسام کے طریقوں سے اس کو ستاتے اور اس کی ذلت ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ وہ برہان حق اپنے ساتھ رکھتا ہے اس لئے آخر ان سب پر غالب آتا ہے اور اس کی سچائی کی کرنیں بڑے زور سے دُنیا میں پھیلتی ہیں اور جب خدا تعالیٰ دیکھتا ہے کہ زمین اس کی صداقت پر گواہی نہیں دیتی تب آسمان والوں کو حکم کرتا ہے کہ وہ گواہی دیں سو اُسکیلئے ایک روشن گواہی خوارق کے رنگ میں دعاؤں کے قبول ہونے کے رنگ میں اور حقائق و معارف کے رنگ میں آسمان سے اُترتی ہے۔ اور وہ گواہی بہروں اور گونگوں اور اندھوں تک پہنچتی ہے۔ اور بہتیرے ہیں جو اس وقت حق اور سچائی کی طرف کھینچے جاتے ہیں مگر مبارک وہ جو پہلے سے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ان کو بوجہ نیک ظن اور قوت ایمان کے صدیقوں

کی شان کا ایک حصّہ ملتا ہے اور یہ اس کا فضل ہے جس پر چاہے کرے۔

اب اتمام حجت کے لئے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اسی کے موافق جو ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔ خداتعالےٰ نے اس زمانہ کو تاریک پاکر اور دنیا کو غفلت اور کفر اور شرک میں غرق دیکھ کر اور ایمان اور صدق اور تقوےٰ اور راست بازی کو زائل ہوتے ہوئے مشاہدہ کر کے مجھے بھیجا ہے کہ تا وہ دوبارہ دنیا میں علمی اور عملی اور اخلاقی اور ایمانی سچائی کو قائم کرے اور تا اسلام کو ان لوگوں کے حملہ سے بچائے جو فلسفیت اور نیچریت اور اباحت اور شرک اور دہریت کے لباس میں اس الٰہی باغ کو کچھ نقصان پہنچانا چاہتے ہیں سوائے حق کے طالبو سوچ کر دیکھو کہ کیا یہ وقت وہی وقت نہیں ہے جس میں اسلام کیلئے آسمانی مدد کی ضرورت تھی۔ کیا ابھی تک تم پر یہ ثابت نہیں ہوا کہ گذشتہ صدی میں جو تیرہویں صدی تھی۔ کیا کیا صدمات اسلام پر پہنچ گئے۔ اور ضلالت کے پھیلنے سے کیا کیا ناقابل برداشت زخم ہمیں اٹھانے پڑے۔ کیا ابھی تک تمنے معلوم نہیں کیا کہ کن کن آفات نے اسلام کو گھیرا ہوا ہے۔ کیا اسوقت تمکو یہ خبر نہیں ملی کہ کسقدر لوگ اسلام سے نکل گئے۔ کسقدر عیسائیوں میں جا ملے کسقدر دہریہ اور طبعیہ ہو گئے اور کسقدر شرک اور بدعت نے توحید اور سنت کی جگہ لے لی۔ اور کسقدر اسلام کے ردّ کیلئے کتابیں لکھی گئیں۔ اور دنیا میں شائع کی گئیں سو تم اب سوچکر کہو کہ کیا اب ضرورت نہ تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اس صدی پر کوئی ایسا شخص بھیجا جاتا جو بیرونی حملوں کا مقابلہ کرتا۔ اگر ضرور تھا تو تم دانستہ الٰہی نعمت کو ردّ مت کرو اور اس شخص سے منحرف مت ہو جاؤ جس کا آنا اس صدی پر اس صدی کے مناسب حال ضروری تھا۔ اور جس کی ابتداء سے نبی کریمؐ نے خبر دی تھی اور اہل اللہ نے اپنے الہامات اور مکاشفات

سے اُس کی نسبت لکھا تھا ذرہ نظر اٹھا کر دیکھو کہ اسلام کو کس درجہ پر بلاؤں نے مجبور کر لیا ہے۔ اور کیسے چاروں طرف سے اسلام پر مخالفوں کے تیر چھوٹ رہے ہیں اور کیسے کروڑ ہا نفسوں پر اس زہر نے اثر کر دیا ہے یہ علمی طوفان یہ عقلی طوفان یہ فلسفی طوفان یہ مکر اور منصوبوں کا طوفان یہ فسق اور فجور کا طوفان یہ لالچ اور طمع دینے کا طوفان یہ اباحت اور دہریت کا طوفان یہ شرک اور بدعت کا طوفان جو ہے ان سب طوفانوں کو ذرہ آنکھیں کھول کر دیکھو اور اگر طاقت ہے تو ان مجموعہ طوفانات کی کوئی پہلے زمانہ میں نظیر بیان کرو اور ایمانًا کہو کہ حضرت آدم سے لیکر تا ایندم اس کی کوئی نظیر بھی ہے اور اگر نظیر نہیں تو خدا تعالےٰ سے ڈرو اور حدیثوں کے وہ معنے کرو جو ہو سکتے ہیں واقعات موجودہ کو نظر انداز مت کرو تا تم پر کھل جائے کہ یہ عام ضلالت وہی سخت دجالیت ہے جس سے ہر ایک نبی ڈراتا آیا ہے جس کی بنیاد اس دنیا میں عیسائی مذہب اور عیسائی قوم نے ڈالی جس کے لئے ضرور تھا کہ مجدد وقت مسیح کے نام پر آوے کیونکہ بنیاد فساد مسیح کی ہی اُمت ہے۔ اور میرے پر یہ کشفًا ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ زہرناک ہوا جو عیسائی قوم سے دنیا میں پھیل گئی۔ حضرت عیسٰے کو اس کی خبر دی گئی تب انکی روح روحانی نزول کیلئے حرکت میں آئی۔ اور اُس نے جوش میں آکر اور اپنی اُمت کو ہلاکت کا مفسدہ پرواز پاکر زمین پر اپنا قایم قایم اور شبیہ چاہا جو اس کا ایسا ہم طبع ہو کہ گویا وہی ہو سو اس کو خدا تعالےٰ نے وعدہ کے موافق ایک شبیہ عطا کیا اور اس میں مسیح کی ہمت اور سیرت اور روحانیت نازل ہوئی اور اس میں اور مسیح میں بشدت اتصال کیا گیا گویا وہ ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے بنائے گئے اور مسیح کی توجہات

نے اُسکے دِل کو اپنا قرار گاہ بنایا اور اُس میں ہوکر اپنا تقاضا پورا کرنا چاہا پس ان معنوں سے
اس کا وجود مسیح کا وجود ٹھہرا اور مسیح کے پُرجوش ارادات اس میں نازل ہوئے جن کا نزول
الہامی استعارات میں مسیح کا نزول قرار دیا گیا یاد رہے کہ یہ ایک عرفانی بھید ہے کہ
بعض گذشتہ کاملوں کا ان بعض پر جو زمین پر زندہ موجود ہوں عکس توجہ پڑکر اور اتحاد
خیالات ہوکر ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کے ظہور کو اپنا ظہور سمجھ لیتے ہیں۔
ہیں۔ اور ان کے ارادات جیسے آسمان پر اُن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ویسا ہی
باذنہٖ تعالیٰ اس کے دل میں جو زمین پر ہے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی روح جسکی
حقیقت کو اس آدمی سے جو زمین پر ہے متحد کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا ملکہ رکھتی ہے
کہ جب چاہے پورے طور پر اپنے ارادات اس میں ڈالتی رہے اور ان ارادات
کو خدا تعالےٰ اس دل سے اس دل میں رکھ دیتا ہے غرض یہ سنت اللہ ہے
کہ کبھی گذشتہ انبیاء اولیاء اس طور سے نزول فرماتے ہیں اور ایلیا ہی نے یحییٰ نبی
میں ہوکر اسی طور سے نزول کیا تھا۔ سو مسیح کے نزول کی سچی حقیقت یہی ہے جو اس عاجز
پر ظاہر کی گئی اور اگر اب بھی کوئی باز نہ آوے تو میں مباہلہ کے لئے تیار ہوں پہلے صرف
اس وجہ سے میں نے مباہلہ سے اعراض کیا تھا کہ میں جانتا تھا کہ مسلمانوں سے ملاعنہ
جائز نہیں مگر اب مجھ کو بتلایا گیا کہ جو مسلمانوں کو کافر کہتا ہے اور اس کو اہل قبلہ اور کلمہ گو
اور عقاید اسلام کا معتقد پاکر پھر بھی کافر کہنے سے باز نہیں آتا وہ خود دائرہ اسلام
سے خارج ہے۔ سو میں مامور ہوں کہ ایسے لوگوں سے جو ائمۃ التکفیر ہیں اور مفتی اور
مولوی اور محدث کہلاتے ہیں اور ابناء اور نساء بھی رکھتے ہیں مباہلہ کروں
اور پہلے ایک عام مجلس میں ایک مفصل تقریر کے ذریعہ سے ان کو اپنے دلائل

سمجھا دوں اور اسی مجلس میں اُن کے مشکوک اور شبہات کا جواب کے دل میں خلجان کرتے ہیں۔ جواب بھی دے دوں اور جو کافر کہنے سے باز نہ آویں تو ان سے مباہلہ کروں۔ مباہلہ اس بنا پر نہیں ہوگا کہ وہ اپنے اصطلاحی نام اہلِ سنت والجماعت سے مجھ کو باہر کیوں سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے تو مجھ کو کچھ بھی رنج نہیں جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک غیر مقلد جو اپنے تئیں اہلِ حدیث کہلاتا ہے آئمہ اربعہ کے مقلدین کا نام بدعتی اور فیج اعوج رکھتا ہے اور صحابہ کرام کے طریق سے ان کو باہر سمجھتا ہے۔ اور جماعت سلف کا ان کو مخالف خیال کرتا ہے ایسا ہی ایک مثلاً حنفی تمام موحدین غیر مقلدین کو بدمذہب اور سنت جماعت کے احاطہ سے باہر یقین رکھتا ہے تو پھر مجھے کیوں افسوس کرنا چاہیئے کہ میں کیوں سنت جماعت سے باہر کیا جاتا ہوں در حقیقت اہلِ سنت والجماعت کہلانا آجکل کسی خاص فرقہ کا حق تسلیم نہیں کیا گیا ہر ایک اپنے زعم میں اہلِ سنت ہے۔ اور دوسروں کو اس سے خارج کر رہا ہے پس یہ کچھ ایسا جھگڑا نہیں جسکا عنداللہ بہت قدر ہو۔ مگر جزئیات کے اختلاف کی وجہ سے کسی کو جھٹ پٹ کافر کہہ دینا اور ہمیشہ کے جہنم کا سزاوار اس کو ٹھہرانا یہ امر در حقیقت عنداللہ کوئی سہل اور معمولی بات نہیں بلکہ بہت ہی بڑا ہے اور جائے تعجب ہے کہ ایک شخص کلمہ گو ہوا ور اہلِ قبلہ اور موحد اور اللہ اور رسول کو ماننے والا اور ان سے سچی محبت رکھنے والا اور قرآن کریم پر ایمان لانے والا ہو اور پھر کسی جزئی اختلاف کی وجہ سے وہ ایسا کافر ٹھہر جائے کہ یہود نصاریٰ کی طرح بلکہ اُن سے بھی بدتر شمار ہو۔ اور میاں نذیر حسین اور شیخ بطالوی اس بات پر راضی ہوں کہ وہ نہ صرف کافر بلکہ اس کا نام اکفر رکھا جائے یعنے ہمیشہ کی جہنم سے بھی اسکی سزا

کچھ زیادہ ہو۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ صحابہؓ میں بڑے بڑے اختلاف تھے اور ان میں سے کوئی بھی اختلاف سے بچ نہیں سکا نہ صدیقؓ نہ فاروقؓ نہ دوسرا کوئی صحابی بلکہ مروی ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ باوجود اپنی اس جلالت وشان کے جو علماً میں مسلم ہے دینی امور میں تمام جماعت صحابہ سے پچاس مسئلہ میں مخالف تھے اور یہ مخالفت اس کمال تک پہنچ گئی تھی کہ بعض ایسے امور کو وہ حلال جانتے تھے جن کو دوسرے صحابہؓ حرام قطعی بلکہ صریح فسق سمجھتے تھے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت معاویہؓ اور ان کے گروہ کے لوگ معراج اور رؤیت باری کے بارے میں دوسرے صحابہ سے بکلی مخالف تھے۔ مگر کوئی کسی کو کافر نہیں کہتا تھا مگر یہ زمانہ ایک ایسا زمانہ آیا کہ مولویوں نے اپنے بھائی مسلمان بھائی کو کافر کہہ دینا اور ہمیشہ کے لئے جہنمی قرار دے دینا ایک ایسی سہل بات سمجھ لی کہ جیسے کوئی پانی کا گھونٹ پی لے اسی پرانی عادت کی وجہ سے اس عاجز کو بھی انہوں نے کافر ٹھہرایا سواب میں مامور ہوں جو انہیں لوگوں سے جو ائمۃ التکفیر ہیں یعنی نذیر حسین دہلوی اور شیخ محمد حسین بٹالوی اور جو ان کے ہم رتبہ اور ہم خیال ہیں مباہلہ کی درخواست کروں لہٰذا اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے ان ائمۃ التکفیر کے نام پر مباہلہ کا اشتہار ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد حضورؑ نے اسلامی علماء اور سجادہ نشینوں کو اور دیگر مذاہب کے پیشواؤں کو مباہلہ کا چیلنج دیا ہے جو ایک دوسرے تحریک میں درج ہے۔ لیکن کسی کو بھی میدان مباہلہ میں آنے کی جرأت نہیں ہوئی :؛